Date of Publication: 23-03-2013 **PRICE Rs. 2/-**

POSTED ON 24-25 March 2013 | POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
R.N.I No. 2186/57 | Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 April 2013 — یکم تا ۷/اپریل ۲۰۱۳ء

Issue: 13, Vol.: 72 — شمارہ نمبر: ۱۳، جلد نمبر: ۷۲

دستور ہند (Constitution of India) کا ابتدائیہ (Preamble) ملک کے عوام کے عزم کا اعلان اس طرح کرتا ہے:

''ہم ہندستان کے عوام ہندستان کو ایک خود مختار، اشتراکی، سیکولر اور جمہوری ریپبلک بنانے کا سنجیدگی سے عزم کرتے ہوئے اس کے باشندوں کو سیاسی اور سماجی انصاف، خیالات، اظہار رائے، یقین، عقائد، عبادات کی آزادی، وقار اور مواقع کی برابری کے حصول اور ان کے مابین مساوات کے فروغ، عزت نفس، یکجہتی اور ملک کی سالمیت کی ضمانت دیتے ہوئے آج یعنی ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو اپنی مجلس قانون ساز میں پاس کرتے ہوئے اپنے لیے نافذ العمل قرار دیتے ہیں''۔

اس طرح ابتدا ہی میں یہ بات واضح

تہذیبی وراثت کو قائم اور محفوظ رکھنے کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی طرح آرٹیکل 30 ہر اقلیت خواہ وہ مذہبی ہو یا لسانی، کو اپنے تعلیمی ادارے کھولنے اور اس کے انتظام و انصرام کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ سپریم کورٹ کی تشریح کے مطابق اس کا فیصلہ صوبائی سطح پر طے ہوگا یعنی اگر کشمیر میں کوئی ہندی زبان و تعلیم کا ادارہ کھولے تو وہاں اقلیتی ادارہ تسلیم ہوگا، آسام میں کوئی پنجابی زبان یا سکھ مذہب کا ادارہ کھولے تو اس صوبہ میں اسے اقلیتی ادارے کی حیثیت حاصل ہوگی۔

دفعہ 29 کی تشریح و تفسیر عدالت عظمیٰ نے اپنے ایک اہم فیصلے میں جو آل انڈیا رپورٹر ۱۹۹۵ء کے صفحہ 183 پر رپورٹ کیا گیا ہے (جگدیو سنگھ بنام سدا شیو پرتاپ سنگھ) اس طرح کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زبان اور رسم الخط

دستورِ ہند کے دائرے میں اردو کے فروغ کی صورتیں

کردی گئی ہے کہ یہ دستور کوئی باہر سے درآمد شدہ حکم نامہ یا تھوپا گیا قانون نہیں ہے بلکہ یہاں کے عوام نے اسے خود بنایا ہے اور خود پر نافذ العمل قرار دیا ہے۔ آئیے اس کی کچھ دفعات کا سرسری تذکرہ کرتے ہیں جو ہمارے موضوع کی تفہیم میں معاون ہوگا۔

آرٹیکل 19 میں سب باشندوں کو اظہار رائے کی آزادی، آزادانہ طور پر پورے ملک میں رہنے، گھومنے پھرنے، انجمن یا یونین بنانے، اپنی مرضی سے پیشہ (Profession) یا بزنس اختیار کرنے کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے تو آرٹیکل 21 باوقار زندگی گزارنے کی آزادی دیتا ہے۔

آرٹیکل 25 ہر باشندے کو ضمیر کی آزادی اور کوئی بھی مذہب، مسلک اختیار کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کرنے کی گارنٹی دیتا ہے۔ آرٹیکل 26 مذہبی اور عوامی بہبود کے ادارے کھولنے، اپنے مذہبی معاملات کو خود چلانے کی خود مختاری دیتا ہے۔ دفعہ 29 ہر اقلیتی طبقے کو جو اپنی منفرد زبان رکھتے ہوں، اس کی حفاظت، اس کے رسم الخط کی حفاظت اور اپنی

کی حفاظت کے لیے دوران الیکشن سیاسی تقریر بھی کرے تو اسے انتخاب قانون مجریہ ۱۹۵۱ء Representation of people Act کی دفعہ (3)123 کے تحت غلط عمل (Corrupt Practice) نہیں کہا جاسکتا یعنی مذکورہ قانون میں کسی بھی منتخب امیدوار کے الیکشن کو اس بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے غیر قانونی عمل کیا ہے کیوں کہ اسے آئین کی دفعہ 29 میں ایسا کرنے کا بنیادی حق ہے۔

اقلیت کے معنی: حالاں کہ آئین ہند میں اقلیت کی تعریف درج نہیں ہے لیکن مجلس قانون ساز Constituent Assembly کو اس کی مشاورتی کمیٹی Advisory Council نے جو سفارش کی تھی وہ یہ تھی:

''ہر یونٹ کی اقلیتوں کو زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت کا حق ہوگا اور کوئی قانون ایسا نہ بنایا جائے گا جو اس ضمن میں مداخلت آمیز یا اس کے مفاد کے خلاف ہو''۔

مگر جب یہ مسودہ ڈرافٹ کمیٹی کے پاس گیا تو اس نے لفظ اقلیت کی جگہ

محمد عبدالقدیر (سینئر ایڈوکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ، الہ آباد [یو۔ پی])

(باشندوں کا طبقہ) Section of Citizen یہ کہہ کر لکھ دیا کہ یہ وسیع تر معنوں میں ہے، جس میں اقلیت بھی شامل ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جہاں لفظ اقلیت (Minority) استعمال نہیں ہے اور باشندوں کا گروپ استعمال ہوا ہے وہ بھی اقلیت کے معنوں میں متصور کیا جائے گا۔ عام مفہوم میں یہ لفظ مذہبی یا لسانی کثرت کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو مذہبی اور لسانی اعتبار سے قلیل ہوں۔ یہی مفہوم اس دفعہ میں مستعمل ہے۔

اسی طرح آرٹیکل 30 ہر اقلیت کو خواہ مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی بنا پر، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولنے اور ان کا انتظام کرنے کا بنیادی حق فراہم کرتا ہے۔ مرکزی یا صوبائی حکومت محض مذہب یا زبان کی بنا پر سرکاری امداد دینے میں کوئی امتیاز نہیں برت سکتی۔

مذکورہ بالا پس منظر میں ہمیں وہ امکانات تلاش کرنا ہیں کہ جن سے اردو زبان کے حقوق کی حصول یابی کی کلید

حاصل ہو۔ ہم اردو زبان والوں کا یہ المیہ ہے کہ اردو کا ماتم اور مرثیہ خوانی یہ اہتمام کرتے ہیں بس عمل نہیں کرتے۔ لاکھوں روپیوں کی سرکاری گرانٹس، نشست و گفت میں مال مفت کی طرح بے رحمی سے ہضم کرلیتے ہیں یا اڑا دیتے ہیں۔ اردو کو ایسے مردمیداں چاہئیں جو اس کے لیے منصوبہ بند طریقے سے پیشہ ورانہ (Professional) انداز میں ایک لائحۂ عمل بنا کر کام کریں، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔

راقم الحروف اپنے ایک حالیہ مضمون 'اردو زبان اور ہندستان کا دستور' میں دفعہ 347, 346, 345, 243 کے حوالے سے تحریر کرچکا ہے کہ صوبائی حکومت یا اداروں کو ملک کے صوبوں یا صوبوں کے جن حصوں یا علاقوں میں اردو زبان بولنے والے خاطر خواہ تعداد میں رہتے ہیں وہاں کس طرح صدر جمہوریہ ہند یا گورنر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے سکتے ہیں اور حکومت ہند یا صوبائی حکومتوں کو اردو زبان کی

ترویج و ترقی، فروغ و اشاعت کے احکام صادر فرماسکتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تفصیل دہرانے کی بجائے اشارے کافی ہوں گے۔

دفعہ 350 کے حوالے سے یہ تحریر کیا جاچکا ہے کہ ہر صوبائی حکومت اور علاقائی اداروں کی ذمے داری ہوگی کہ وہ اپنے عوام کو مادری زبان میں تعلیم کی سہولتیں مہیا کریں، بالخصوص پرائمری درجات میں۔ اسی طرح دفعہ 351 جو ہندی زبان کے فروغ سے متعلق ہے، اس میں بھی مقامی زبانوں کے فروغ پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ جس پر ابھی تک کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی۔

لہٰذا اس تحریر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آئین کی مذکورہ بالا دفعات سے مترشح حقوق کو ہم اردو زبان کی خدمت کے لیے کس طرح کام میں لائیں۔ لہٰذا یہاں ان چند بنیادی نکات کو درج کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ محض کام شروع کرنے (to start with) کے مقصد سے ہیں، حتمی نہیں۔ لہٰذا اس

ابتدا کے لیے:

۱- وہ تمام ادارے جو اردو زبان کے فروغ یا خدمت کے لیے مرکزی حکومت نے قائم کیے ہوں یا مرکز سے امداد پاتے ہوں وہ ایک متحدہ لائحۂ عمل تیار کریں۔

۲- بہتر تو یہ ہے کہ جن صوبوں میں اردو اکادمیاں یا دوسرے سرکاری ادارے قائم ہیں ان میں ایک مشترک لائحۂ عمل اور اشتراک Coordination ہو جائے کہ وہ ان حقوق کی حصولیابی کے لیے مشترک اقدام کریں۔

۳- یونیورسٹیوں، ڈگری کالجوں، انٹر کالجوں کے اردو شعبوں میں اساتذہ میں کوآرڈینیشن (Co ordination) ہو، گروپ اور کمیٹیاں تشکیل دی جائیں، جو اپنے حلقے، صوبوں میں مشترک اقدام کریں۔

۴- پرائیویٹ ادارے، انجمن، بزم، لائبریری جو اردو کی خدمت میں مصروف ہیں وہ متحدہ پلیٹ فارم بنائیں۔ قومی لیول پر، صوبائی لیول پر، ضلع، تحصیل، نگر پنچایت، گاؤں پنچایت لیول پر متحدہ پلیٹ فارم بنائیں۔

۵- اردو دوست از خود انفرادی یا فروغ اردو کے نام سے پرائیویٹ انجمن بنائیں یا جہاں کہیں انجمنیں پہلے سے ہوں وہ خود اس کی سمت قدم بڑھائیں۔

کرنے کے چند کام:

1. ہر گاؤں پنچایت، نگر پنچایت، ضلع پنچایت اور ضلع میں چند فعال حضرات کو جمع کر کے یہ کوشش کی جائے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے، ان کے لیے دفعہ 350 کی رو سے اردو زبان کی تعلیم کا بندوبست کرانے کی کوشش کی جائے۔ اردو مدرس تعینات کرانے کی کوشش کی جائے۔ اگر اردو زبان کا مدرس وہاں منظور (Sanction) نہ ہو تو خود چندہ کر کے ایک اردو مدرس کی تنخواہ کا انتظام کر کے استاد فراہم کر دیا جائے جب تک کہ باقاعدہ مدرس کا تقرر نہ ہو جائے۔

ضلع بیسک آفیسر، ضلع انسپکٹر آف اسکول، ڈپٹی یا جوائنٹ ڈائرکٹر یا ڈائرکٹر (اردو) سے کوشش کر کے اس اسکول میں اردو ٹیچر کی پوسٹ کو منظور (Post Sanction) کرایا جائے۔ وہ کان نہ دھریں تو حکمران یا سیاسی جماعت کے انصاف پسند عہدیداران کی مدد سے اس دفعہ کے حوالے سے حکومت سے رجوع کیا جائے۔ جب کچھ نہ ہو تو کورٹ میں اس دفعہ کے نفاذ کے لیے مفاد عامہ کی رٹ دائر کی جائے، مگر یہ کام بتدریج اور منصوبہ بند طریقے سے ہو۔ حکومت یا سرکاری اداروں سے تصادم (Confrantation) سے کام نہ لے کر لگاتار مخلصانہ کوشش اور اخلاقی و سیاسی دباؤ کا استعمال حکمت عملی کے ساتھ کیا جائے۔

2. دفعہ 351 کے تحت صدر جمہوریہ ہند سے نمائندگی کی جائے اور انھیں باور کرایا جائے کہ ہمارے ضلع، علاقے جہاں عوام کی مادری زبان اردو ہے وہاں وہ مرکزی اور صوبائی حکومت کو ہدایت دیں کہ ان کی تعلیم کا بندوبست اردو زبان میں کیا جائے۔ اس میں اپنے علاقے کے ممبر پارلیمان سے بھی مدد حاصل کی جائے۔ ایسا ہی ممبر اسمبلی کی مدد سے گورنر کے حوالے سے کیا جائے۔

3. وہ ممبر پارلیمان جن کی مادری زبان اردو ہے، دفعہ 350B میں صدر جمہوریہ کو یاد کرائیں کہ گوپال سنگھ کمیٹی رپورٹ، اندر کمار گجرال کمیٹی رپورٹ، سچر کمیشن رپورٹ اور رنگ ناتھ مشرا رپورٹ کی روشنی میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت دیں کہ اردو زبان سے متعلق ان کی سفارشات کو عملی جامہ پہنائیں۔

یہ بھی باور کرایا جائے کہ دفعہ 351 کی رو سے ہندی (قومی) زبان کی ترقی کو بامعنی اور موثر بنانے کے لیے اردو اور ضمیمہ 8 میں شامل دوسری ہندستانی زبانوں کو بھی آئینی طور پر فروغ دیا جائے۔

4. مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ جتنے مرکزی محکمے، دفتری یا دفاتر ہیں ان کے کام کاج کے لیے جتنے ادارے ہیں ان کو ہدایت دی جائے کہ جہاں خاطر خواہ لوگوں کی مادری زبان اردو ہے وہاں اردو کو علاقائی زبان (Reagional Language) کا درجہ دیا جائے۔ اس سے بہت سے محکموں بالخصوص بینک، ریلوے، ڈاک خانے وغیرہ جیسے دفاتر میں اردو کا استعمال شروع ہو جائے گا تو اردو جاننے والوں کا تقرر بھی ہوگا۔ اس کی ماضی میں مثالیں ہیں کہ ریلوے محکمے نے اردو میں ٹائم ٹیبل شائع کرنا شروع کر دیا تھا مگر چند سال بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا اس کا احیا فوراً کرایا جائے اور اس کو اردو والے تحریک دیں بھی۔

5. اسی طرح سے اگر مادری زبان بولنے والے طے کرلیں کہ ہم خط و کتابت اردو میں ہی کریں گے اور وہ ڈاک خانہ یا کوریئر میں پتا صرف اردو میں ہی لکھنے لگیں تو حکومت یا کوریئر (Courier) کمپنیوں کو اردو جاننے والے ملازم رکھنا ضروری ہو جائے گا۔

6. اگر کوئی کچھ نہ کرے تو دفعہ 29 اور 30 کے محافظت یافتہ اداروں کو کس نے روکا ہے کہ وہ اردو زبان کی تعلیم نہ دیں۔ پھر پرائیوٹ اداروں پر تو کوئی رکاوٹ ہی نہیں۔ جو نیئری کے مقدمات سپریم کورٹ تک لڑتے ہیں مگر اردو مضمون اور اردو ٹیچر کے مسئلے پر کیوں خاموش یا بے عمل ہیں۔ یہ محض چند باتیں ہیں، اس فہرست میں آئندہ توسیع کی جائے گی۔ یہ کام ایک ساتھ کرنے کے نہیں ہیں ورنہ یہ محض سنگیری لال کے چنے نظر آئیں گے۔ مسئلہ کام سرِدست شروع کرنے کا ہے۔ آپ اپنی صلاحیت، طاقت، وسائل کی مناسبت سے خود طے کریں کہ آپ خود شروعات کہاں سے کرنا چاہیں گے۔ وہی کام شروع کریں جس کی تکمیل و حصول کی آپ میں ہمت اور سکت ہو۔ یہ کام انفرادی حیثیت سے بھی کیا جا سکتا ہے اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ انجمنوں کے ذریعے بھی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح سے بھی۔

ہاں اگر ہمیں اپنی زبان، رسم الخط، تہذیب، ادب اور وراثت کی حفاظت سے محبت ہے تو ہم اس کام میں کسی نہ کسی سطح پر ہاتھ ضرور بٹائیں گے کہ اردو زبان پکار رہی ہے کہ اے اردو والو! مجھے سنبھالو کہ میں تمہاری شناخت کا حوالہ ہوں۔

(بہ شکریہ 'اردو دنیا' دہلی، مارچ ۲۰۱۳ء)

دوسری اور آخری قسط

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کی غالب شناسی

(غالبؔ مدح و قدح کی روشنی میں)

کلیم صفات اصلاحی (دارالمصنفین شبلی اکادمی، پوسٹ بکس نمبر 19، شبلی روڈ، اعظم گڑھ 276001)

میر اور غالب کی مقبولیت کے متعلق سید صاحب کی رائے:

محققین کے نزدیک میر و غالب کی مقبولیت کے سلسلے میں متعدد رائیں ہیں، کسی کے یہاں غالب میر سے زیادہ مقبول ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ میر کی مقبولیت کو کوئی دوسرا شاعر پا نہیں سکتا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے تحقیقی اور ادبی ذوق کے نتیجے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر کو غالب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں اور بقول سید صباح الدین یہ ان کی مخلصانہ تحقیق کے سبب ذاتی رائے ہے، اس سے اتفاق ضروری نہیں، اسی طرح نقد غالب میں غالب کی افضلیت پر مہر تصدیق ثبت کی گئی ہے۔ ان دونوں رایوں کے مطالعے و تجزیے میں صباح الدین صاحب نے جو اپنی رائے حوالۂ قارئین کی ہے وہ بڑی اہم اور دل چسپ ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ موجودہ دور میں میر سے زیادہ غالب کو مقبولیت حاصل ہے۔ اس میں جہاں غالب کے کلام کی نرالی طرزِ فکر و احساس اور متنوع تجربات و معانی اور شگفتہ لب و لہجے کی مجموعی خوبیوں کو دخل ہے وہاں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ میر کے ضخیم دواوین کے برخلاف ان کا منتخب کلام لوگوں کے مطالعے میں رہا لیکن آئندہ ان کے پراگندہ، مغلق، مشکل اور نظری کلام کو اکٹھا کر کے ان کا کوئی ضخیم دیوان لوگوں کے سامنے پیش ہوا اور اس کے مطالعے پر اصرار کیا گیا، بہت ممکن ہے غالب کی وہ مقبولیت باقی نہ رہے گی جو آج ان کو حاصل ہے۔"[۱]

شیخ اکرام کے مطالعۂ غالب پر تنقید:

پاکستان کے مشہور اہل قلم شیخ اکرام کا شمار ناقدین شبلی و غالب میں ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف 'غالب نامہ' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں لیکن ہر ایڈیشن میں غالب کے متعلق ان کی رائے بدل جایا کرتی تھی۔ ان کے اس انداز تدبیر اور طرز غور و فکر پر مصنف نے بڑی سلجھی ہوئی اور اہم رائے تحریر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"تاثر مطالعہ کے بعد کسی رائے کو بدل دینا کوئی عیب نہیں، میرا خیال ہے کہ اکرام صاحب کے غور و فکر پر ان کے بیان کا زور اور ان کی ذہانت کی طراری زیادہ چھائی رہتی ہے۔ ان کی تحریروں میں بہتے ہوئے

چشمہ کے سکون اور ٹھہراؤ کے بجائے اچھلتے ہوئے چشمہ کی لہریں مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہیں، اسی طرح ان کی تحریروں کی لہریں اضطراری ہیں اور اکثر جب چاہتی ہیں مختلف شکلیں بدل کر طرح طرح کی سمتیں اختیار کرلیتی ہیں، جو مصنف اپنی کتاب کے ہر نئے اڈیشن میں اپنی رائے بدلتا رہتا ہے، اس کی رائے کی اصابت پر بھروسہ کرے اس کے ناظرین کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔"

غالب کی شاعری پر شبلی کے خیالات کی وضاحت و ترجمانی:

علامہ شبلی غالب کی نثر اور شاعری دونوں کے معترف تھے اور غالب کے متعلق سب سے پہلے علامہ شبلی نے کہا تھا کہ "وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے"۔ یہ جامع تعریف شبلی کے مطالعۂ غالب پر روشنی ڈالتی ہے اور بتاتی ہے کہ انھوں نے غالب کا کس قدر گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ غالب کی خطوط نگاری کے متعلق ان کے سب سے مستند اور بڑے سوانح نگار حالی کے بھی حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ غالب نے مکاتبہ کو مکالمہ کردیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کررہے ہیں"۔ غالب کے اس انداز خطوط نگاری کو علامہ شبلی اس قدر پسند کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی مراسلت میں اس طرز کی کامل اتباع کی۔ شبلی نے غالب کی شاعری پر مجمل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کرلیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد اور مبالغے کے سوا اور کچھ نہیں، میر تقی کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں لیکن ان بیش بہا خزانوں میں بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے"۔

غالب کے فلسفے کو شاعری کی جان سے تعبیر کرنا یقیناً منفرد قول ہے، اس مجمل بیان کی تشریح و ترجمانی ضروری تھی، سید صاحب نے اس فرض کو بہ خوبی نبھایا ہے اور علامہ شبلی کے مطلب کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"اس اقتباس (جو اوپر گزرا) سے ظاہر ہے کہ مولانا شبلی غالب کی شاعری کے فلسفہ کو اردو شاعری کی جان اور بیش بہا خزانہ سمجھتے تھے لیکن شاعری میں فلسفہ سے ان کی جو مراد ہے وہ آج کل کے فلسفہ کی اصطلاح سے مختلف ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ عالم میں جو کچھ موجود ہے بلکہ کاروبار زندگی کی روزمرہ باتیں بھی اگر نگاہ حقیقت سے دیکھی جائیں تو یہ سب فلسفہ ہیں اگر کوئی شاعر اپنی شاعری میں موثر انداز سے یہ پیش کرتا ہے کہ مذہبی جھگڑے کی اصل دنیوی اغراض ہوتے ہیں، خودغرضی نامعقولیت کا سبب ہے، انسان کو جو چیز حاصل نہیں ہوتی، اس پر وہ حسد کرتا ہے، اخلاق رذیلہ کی موجودگی ہی میں انسان کی بقا اور ترقی ہے، عوام کے لیے آزادی مفید نہیں، ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہے، انسان کو خدا نے اختیار دیا ہے کہ وہ متناقض کاموں میں سے جس کام کو چاہے اختیار کرے وغیرہ تو یہ سب مولانا شبلی کے خیال کے مطابق شاعری میں فلسفہ بن جاتے ہیں اس لحاظ سے غالب کی شاعری واقعی فلسفہ اور اردو شاعری کی جان ہے"۔

'یادگار غالب' کے بغیر غالب کو صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جاسکتا:

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ 'یادگار غالب' غالبیات کا سب سے مستند اور بنیادی تذکرہ ہے، اس لیے کہ مصنف خود اپنے ممدوح کی نقل و حرکت اور ادبی وشعری سرگرمیوں کا چشم دید گواہ ہے، اس نے اپنے ممدوح کی شاگردی کا شرف حاصل کیا ہے لہٰذا اصولی اعتبار سے اس کے بیانات کو سند اعتبار یقیناً حاصل ہوگی یہی وجہ ہے کہ مصنف نے 'یادگار غالب' پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور اپنے مطالعے کا جو نتیجہ تحریر کیا ہے وہ بھی قدر و قیمت اور اہمیت میں کم نہیں ہے، مصنف 'یادگار غالب' کو حالی کے مرشد غالب کے اعجاز کا انتخاب مانتے ہیں اور مختلف اعتبار سے اس کو ایک بے نظیر تصنیف خیال کرتے ہیں، ان کے مطابق جب تک غالب کا نام زندہ ہے اس وقت تک یہ کتاب بھی زندہ رہے گی، غالب کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے، حالی پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کی کمزوریوں اور عیوب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن صباح الدین عبدالرحمن اس کو بے بنیاد الزام بتاکر کہتے ہیں کہ حالی اگر ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تو بھی نہ ڈال پاتے کیوں کہ غالب نے اپنے مکاتیب اور اشعار میں اپنی تمام کمیوں اور برائیوں کی جانب اشارے خود ہی کردیے ہیں۔" آگے حالی کے بیان کردہ عیوب غالب لکھ کر ناقدین حالی کا جواب بھی دیا ہے اور اپنے دعوے کے توثیقی اور تائیدی دلائل بھی فراہم کردیے ہیں لیکن آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ چوں کہ ان عیوب کی پردہ کشائی کے لیے حالی نے ایسا دلکش طرز اختیار کیا ہے کہ غالب کی ان کمزوریوں کو پڑھنے کے بعد تکدر کے بجائے لبوں پر تبسم آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کھیلتے تھے تو بدائے نام کچھ بازی بدل کر کھیلا کرتے تھے، اسی چوسر کی بدولت ان کو تین مہینے جیل میں گزارنے پڑے۔۔۔ وہ نماز پنج گانہ کے پابند نہ تھے۔۔۔ ان کی شاہد پرستی کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ حالی کے قلم کا جادو ہے کہ غالب کی ان کمزوریوں کو پڑھنے کے بعد تکدر پیدا ہونے کے بجائے لبوں پر تبسم آجاتا ہے اور غالب کے سارے عیوب لطیفوں کی پھلجھڑیوں میں گم ہوجاتے ہیں جو پوری کتاب میں اس طرح سجائے گئے ہیں جیسے آرٹ گیلری میں نادر تصویریں رکھی جاتی ہیں"۔

سرسید کی رائے پر نقد:

اس سے عام اہل ادب ناواقف ہیں کہ سرسید غالب کے اپنے زمانے کے سب سے بڑے قدرداں اور ان کے اوصاف و کمالات کے سب سے بڑے معترف تھے۔ انھوں نے 'آثار الصنادید' میں غالب کے متعلق جو تعریفی اور توصیفی کلمات سپرد قلم کیے ہیں، اس سے بڑھ کر ان کے متعلق آج تک نہیں لکھا جاسکا اور نہ ہی مستقبل میں اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تحریر خود غالب کی نظر سے گزری لیکن انھوں نے اس مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کو ناپسند نہیں کیا۔ سید صباح الدین کے بہ قول سرسید کی یہ مدحت طرازی غالب کو اس لیے گراں نہ گزری ہوگی کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی تعریف اسی انداز میں کی تھی اور تمام تعریفوں سے قطع نظر یہاں ان کی شاعری اور دوسری خوبیوں سے متعلق سرسید نے جو لکھا تھا، صباح الدین صاحب نے درج ذیل لفظوں میں اس کا خلاصہ کیا ہے۔ اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے:

"(سرسید) نے ان کی شاعری کو عارفانہ کلام کہا ہے، قیصر روم کو ان کا جاں نثار بتایا، مولانا جامی جیسے لوگوں کو ان کے تصوف کی شراب کا جرعہ قرار دیا، ان کو ایرج، تور اور بہرام جیسے بادشاہوں کا وارث قرار دیا اور ان کے بازو کے بارے میں لکھا کہ گیو، گودرز اور رہام جیسے قبل تن پہلوان اس کی قوت کو جانتے ہیں"۔

اس پر مصنف کی ناقدانہ رائے ملاحظہ فرمائیں:

"لیکن سرسید نے غالب کی جو مدح کی ہے اس سے موجودہ دور میں غالب کا سب سے بڑا پرستار بھی شاید اتفاق نہ کرے گا اور وہ غالب کو انوری، عنصری، خاقانی، سعدی، حافظ اور خسرو وغیرہ جیسے تمام اساتذہ سے برتر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی اس رائے کا حوالہ موجودہ دور کے مصنفوں اور مقالہ نگاروں کی تحریروں میں دیکھنے میں نہیں آیا"۔

اختر اورینوی کی رائے کا محاکمہ:

پروفیسر اختر اورینوی صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کا غالب پر کوئی ایسا وقیع کام نہیں تھا، البتہ ان کے مجموعۂ مقالات 'قدر و نظر' میں 'اردو شاعری اور غالب - ایک مطالعہ' کے نام سے ایک مضمون شامل ہے۔ اس میں غالب پر اپنے عہد کے ماحول کے اثرات سے متعلق بعض مفید باتوں کے ساتھ ایسے خیالات بھی ظاہر کیے ہیں جن کی جزئیات سے سید صباح الدین صاحب کو اتفاق نہیں، ان کا کہنا ہے کہ اختر صاحب اپنے مختصر مضمون میں غالب کے ذہن کا تجزیہ کرکے ایک رائے پر پہنچے ہیں لیکن اس رائے کو غالب کے جس شعر سے مستحکم و مدلل کرنا چاہتے ہیں وہ کہیں بھی برمحل استعمال نہیں ہوا ہے، مثلاً غالب زندگی سے مجموعی طور پر ناخوش، بے زار اور بے یقین ہیں لیکن غالب کی زندگی سے بیزاری کے لیے جن تین مندرجہ ذیل اشعار:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کو پیش کیا ہے وہ انتخاب کے لحاظ سے صحیح نہیں۔

ایک اور موقعے پر اختر صاحب نے اپنے اس خیال 'غالب اپنے زمانے سے آگے دیکھتا ہے' کی تائید میں جو اشعار نقل کیے ہیں وہ بھی عاجلانہ طور پر نقل کیے ہیں، ان کو دیوان غالب میں اس کے لیے بہت سے اشعار مل سکتے تھے، اختر صاحب نے مذکورہ بالا اپنی رائے کی تائید و شہادت کے لیے درج ذیل شعر تحریر کیا ہے:

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز
کس نے پایا اثر، نالۂ دل ہائے حزیں

مصنف کے مطابق ان اشعار کو غالب نے اپنی بیہودہ گوئی اور ہرزہ سرائی میں شمار کیا ہے، اس میں غالب مستقبل کی کون سی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ بہ ظاہر سمجھ میں نہیں آتا اور نہ کلام غالب کے کسی شارح کو اس میں مستقبل کا ذکر نظر آتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کا تعاقب:

رشید احمد صدیقی اردو ادب کا بڑا نام ہے۔ ان کے ادبی اور ناقدانہ کارناموں کی عظمت و بلندی کے سبب صباح الدین صاحب اپنی اس کتاب پر ان سے مقدمہ لکھوانا چاہتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس شخصیت کا علمی مقام و مرتبہ ان کے دل میں اس قدر عظمت کا حامل ہو جب غالب پر خود اس کی تحریروں کے تجزیاتی و تنقیدی مطالعے کا موقع فراہم ہوا تو ایک دیانتدار مصنف کی طرح آنکھوں پر احترام و عقیدت کی پٹی باندھنے کے بجائے اپنی چشم حقیقت وا رکھی اور ایک انصاف پسند محقق اور ناقد کی حیثیت سے ان کی فروگذاشتوں کی جانب نشان دہی کی، ایک آئیڈیل مصنف کا یہی طرۂ امتیاز ہوتا ہے، ان کے اس مشہور جملہ "مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو، تاج محل" پر تبصرہ کرتے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

سرکاری وغیر سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے

مرادآباد (یکم مارچ)۔ محلہ نور اللہ واقع مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (ایم۔ایس۔او) کی جانب سے ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو زبان کی بے نامگی پر اظہار افسوس کیا گیا اور اس کی بدحالی کو دور کرنے کے لیے حکومت سے مضبوط قدم اٹھانے کا مطالبہ کیا گیا۔ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے ایم۔ایس۔او کے مغربی اترپردیش کے انچارج انیس احمد شیرازی نے کہا کہ اردو زبان کوئی غیر زبان نہیں ہے بلکہ ہندستان کی زبان ہے اور ہندستان ہی میں اس کی نشو ونما ہوئی اور آگے چل کر یہی گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار بنی مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ زبان جو آج دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں گنی جاتی ہے اپنے ہی گھر میں بیگانی ہوتی جارہی ہے اور غیر ملکوں میں اس کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ شیرازی نے کہا کہ اردو کی اس بدحالی میں جہاں فرقہ پرست عناصر کی سازشیں ذمہ دار ہیں وہیں حکومت اور عوام کی لاپروائیاں بھی برابر کی شریک ہیں۔ عوام کی لاپروائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کتنے ہی غیر سرکاری ادارے ایسے ہیں کہ جہاں پر اردو کی تعلیم نہیں دی جارہی۔ شیرازی نے مزید کہا کہ مرکزی اور صوبائی حکومت کو چاہیے کہ اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے اردو کے فروغ کے لیے اقدام کریں کیوں کہ اردو کا زوال صرف اردو ہی کا زوال نہیں بلکہ ہندستان کی اس تہذیب کا زوال ہوگا جس کے لیے ہندستان دنیا بھر میں عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے عوام سے اپیل کی کہ کسی بھی گورنمنٹ اسکول یا غیر سرکاری اسکول میں اپنے بچوں کو داخل کراتے وقت اس بات کا خصوصی طریقے سے خیال رکھیں کہ وہاں پر اردو پڑھائی جارہی ہے یا نہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو میں اعلا تعلیم کی سہولت سے محروم طلبہ اپنی مادری زبان ترک کرنے پر مجبور

80 ہزار اردو آبادی والے علاقے میں محض ایک ہائر سکنڈری اسکول

بردوان، مغربی بنگال (۲۸ فروری)۔ اردو زبان میں اعلا تعلیم کی سہولت میسر نہیں ہونے کے باعث آسنسول سب ڈویژن کے تحت بان پور کا اردو داں طبقہ اپنی مادری زبان کو فراموش کرکے دیگر زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ متعلقہ علاقے کے تحت متعدد اردو پرائمری اسکولوں کے طلبہ کی تعداد میں روز بروز تخفیف ہورہی ہے اور اپنی مادری زبان میں اعلا تعلیم کی سہولت سے محرومیت کی صورت میں اردو داں طبقے میں غم و غصہ پایا جارہا ہے۔ آسنسول سب ڈویژن کی کل آبادی کا تقریباً 35% اردو داں طبقہ ہے۔ صرف شہری نہیں بلکہ دیہی علاقوں میں بھی اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ بان پور کے دھرم پور، حسین نگر، احمد نگر، کریم ڈنگل، عالم نگر، رحمت نگر، آزاد نگر، حیدر نگر اور نئی بستی علاقے میں تقریباً 80 ہزار آبادی اردو داں طبقے پر مشتمل ہے۔ مذکورہ تمام علاقوں میں اردو پرائمری اسکول تو موجود ہیں، لیکن 80 ہزار اردو آبادی والے علاقے میں محض ایک عدد ہائر سکنڈری اردو اسکول ہے۔ بان پور میں واقع رحمت نگر اردو ہائی اسکول پر 80 ہزار اردو آبادی منحصر ہے لیکن صرف ایک ہی ہائر سکنڈری اسکول ہونے کی وجہ سے طلبہ کو داخلے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، نتیجتاً طلبہ کا ایک بڑا حصہ ابتدائی تعلیم کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کردیتا ہے۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق رحمت نگر اردو ہائی اسکول میں رواں تعلیمی سال میں درجہ نہم میں صرف 260 طلبہ کو ہی داخلہ مل پایا حالاں کہ بان پور علاقے میں ہر سال تقریباً 500 سے 600 طلبہ ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن پورے علاقے میں صرف ایک ہائر سکنڈری اسکول ہونے کی صورت میں طلبہ چاروناچار سلسلۂ تعلیم ترک کردیتے ہیں۔ اس ضمن میں مقامی باشندہ محمد سلیم کا کہنا ہے کہ اردو داں طبقے کے طلبہ اپنی مادری زبان اردو میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی زبان میں اعلا تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہوجاتے ہیں، جن طلبہ کی مالی حالت مستحکم ہوتی ہیں وہ آسنسول میں جاکر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آسنسول کارپوریشن کے تحت بان پور علاقے میں اردو پرائمری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد میں بھی روز بروز کمی ہورہی ہے بلکہ اردو میں اعلا تعلیم کی سہولت میسر نہیں ہونے کی وجہ سے طلبہ دیگر زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہیراپور سرکل انسپکٹر (پرائمری) نور علی کا کہنا ہے کہ پرائمری ایجوکیشن میں طلبہ کی تخفیف کی کئی وجوہات ہیں اور سب سے بڑا سبب مالی و سماجی حالات ہیں۔ اعلا تعلیم کے لیے اسکول بھی مہیا نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب حکومت نے اقتدار میں آنے کے بعد بیشتر اردو آبادی والے علاقے میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا لیکن حکومت کے اس فیصلے پر کب عمل ہوگا، بان پور کے طلبہ کو اب صرف اسی موقعے کا انتظار ہے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی تقرری کا مطالبہ

لکھنؤ (۲۸ مارچ)۔ مرکزی حکومت کی جانب سے ملک میں چلائے جارہے تقریباً 11 ہزار اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی تقرری کا مطالبہ کرتے ہوئے آج مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پلم راجو کو ایک میمورنڈم سپا اردو سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سمیع الدین خاں سمیع اور شہریار جلال پوری کی جانب سے دیا گیا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

حکومت دہلی اردو والوں کو گمراہ کرنا بند کرے

نئی دہلی (۲۱ مارچ)۔ فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کی ایک میٹنگ عبدالعلیم برنی کی صدارت اور شکیل احمد صدیقی کی نظامت میں ہوئی۔ میٹنگ میں آٹھویں ماہ اردو زبان کے مسائل پر پروگرام منعقد کرنے، اسکولوں میں داخلے کا عمل شروع ہونے پر طلبہ کو اردو زبان کی تعلیم کے لیے بیداری مہم شروع کرنے اور فیڈریشن میں ممبرسازی کرنے پر بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ دہلی حکومت ۲۰۰۴ء سے ہی اردو والوں کو گمراہ کرتی آرہی ہے۔ دہلی کے تمام اسکولوں میں تقریباً 1250 اردو اساتذہ کی ضرورت ہے جب کہ فی الحال 22 اردو میڈیم اسکولوں میں 587 اردو اساتذہ ہی کام کررہے ہیں۔ عبدالعلیم برنی نے کہا کہ حکومت کے ذمہ داران سے دہلی کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کرنے کو جب ملاقات کی جاتی ہے تو وہ ہر مرتبہ گمراہ کن باتیں کرتے ہیں۔ اس مسئلے کو کئی سالوں سے الجھا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میٹنگ میں نصرالدین غوری، ڈاکٹر زین العابدین، ڈاکٹر انجمن عباس، ہارون مرزا اور دیگر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اسلام پور کے اسکولوں کے طلبہ اردو کتابوں سے محروم

دارجلنگ، مغربی بنگال (۱۶ فروری)۔ نئے تعلیمی سال کو شروع ہوئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزر گیا لیکن شمالی دیناج پور ضلع کے اسلام پور بلاک کے کئی ہائی اسکولوں میں درجہ پنجم تا ہشتم اردو اور ہندی کی کتابیں فراہم نہیں ہیں۔ اسلام پور ہائی اسکول کے ہیڈ ٹیچر اسمٰعیل عجا کا کہنا ہے کہ ضلع پرائمری اسکول کونسل اور سروشکشا ابھیان مشن سے درجہ پنجم تا ہشتم کے لیے ہندی اور اردو کتابیں ابھی تک نہیں آئی ہیں جس کی وجہ سے بچوں کو پریشانی ہورہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس مسئلے پر متعلقہ افسران سے رابطہ کیا گیا ہے، فی الحال معاملہ حل نہیں ہوا ہے۔

شمالی دیناج پور کے ضلع پرائمری اسکول کونسل کے چیئرمین تمیز راے نے کہا کہ کونسل کے ذریعے کئی ہائی اسکولوں کو درجہ پنجم کی کتابیں فراہم کی جاتی ہیں۔ حالاں کہ درجہ پنجم کی ہندی اور اردو کی کتابیں وقت پر آگئی تھیں اور انھیں ارسال بھی کردیا گیا تھا لیکن اسلام پور کے سرکل آفسوں سے اسکولوں کی ضرورت کے مطابق تقسیم نہیں کی گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ اسکولوں میں ضرورت سے زیادہ کتابیں چلی گئیں اور کچھ اسکولوں کو کتابیں ہی نہیں ملیں۔ تمیز راے نے مزید کہا کہ اب ہم لوگ تمام اسکولوں میں ضرورت کے مطابق کتابیں بھیج رہے ہیں۔

سروشکشا ابھیان مشن کے ضلع پروجیکٹ افسر رضا، ہنکریم طرفدار نے کہا کہ ہم مختلف ہائی اسکولوں کے درجہ ششم تا ہشتم کے طلبہ و طالبات کے لیے کتابیں مہیا کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندی اور اردو کتابوں کی کمی تھی۔ اردو کی کتابیں ابھی تک نہیں پہنچی ہیں، اس لیے ہم نے صوبائی سطح کے افسران سے رابطہ کیا ہے اور امید کرتے ہیں کہ بہت جلد اس مسئلے کو سلجھا لیا جائے گا۔

(آزاد ہند۔ کلکتہ)

اردو میڈیم اسکولوں میں اردو سے ناواقف ٹیچروں کی تقرری پر ناراضگی

نئی دہلی (۲۷ فروری)۔ راجدھانی کے اردو میڈیم اسکولوں میں اردو سے ناواقف پرنسپلوں اور اساتذہ کی تقرری پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے رائٹ ٹو ویمن اینڈ چلڈرن ویلفیئر آرگنائزیشن نے سرکار اور محکمۂ ایجوکیشن سے ان پرنسپل و اساتذہ کو فوری طور پر ہٹانے کا مطالبہ کیا ہے۔ تنظیم کی صدر انیس فاطمہ نے جعفرآباد میں منعقد ایک میٹنگ میں کہا کہ اردو کے تئیں ہمدردی اور اس کے فروغ کے لیے اقدامات کرنے کے دعوے والے تو بہت ہیں مگر حقیقت میں اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کے ساتھ جو زیادتی ہورہی ہے اس طرف دھیان کسی کا نہیں ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

آر ٹی سی میں اردو کے استعمال کے لیے میمورنڈم

محبوب نگر (۲۶ فروری)۔ اے پی ایس آر ٹی سی ضلع محبوب نگر کے ریجنل منیجر ایس اے انصاری کو انجمن ویلفیئر سوسائٹی کے صدر جنرل سکریٹری محمد جہانگیر بابا و محمد یعقوب نے ایک یادداشت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ محبوب نگر ضلع میں ۶ اضلاع میں اردو کا چلن نہیں لگنے کے برابر ہے۔ ضلع محبوب نگر کے ۶ ڈپو محبوب نگر،

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

چند معروضات

مکرمی! مجھے آپ کا بیان چھلی مارکیٹ، غازی پور کے بارے میں جو انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس ۲۰ فروری ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، پڑھ کر بہت ہی اچھا لگا۔ آپ پہلے شخص ہیں جو اردو اور آزادی کے شہیدوں کے بارے میں آواز اٹھا رہے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ جیسے نوجوان اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے چند ٹھوس قدم ضرور اٹھائیں گے۔
(انیس الحسن صدیقی۔ گوڑگاؤں)

رشی بنکم کالج میں اردو شعبہ کے قیام کے لیے میمورنڈم

نئی ہٹی، مغربی بنگال (۱۵ فروری)۔ جگدل اسمبلی یوتھ آف مائناریٹی ویلفیئر کی جانب سے نئی ہٹی رشی بنکم چندر کالج میں شعبۂ اردو بمع پاس کورس کے آغاز کے لیے دوبارہ ایک میمورنڈم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر نرمل بھارتی کو دی گئی۔ انھوں نے اس پر مثبت خیال کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ وفد کو بتایا کہ سال ۲۰۰۷ء میں اردو شعبے کے لیے ایک پوسٹ منظور کی گئی جو اتفاق سے شیڈول ٹرائب کے زمرے میں شامل ہے۔ حالاں کہ مغربی بنگال میں اعلیٰ اردو میں ایس سی اور ایس ٹی کوٹا کے تحت اساتذہ دستیاب ہونا ممکن نہیں۔ اگر ممتا بنرجی کی حکومت اور محکمۂ تعلیم اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری قدم اٹھائے تو یقینی طور پر اس مسئلے کا حل نکل آئے گا۔ اس کے بعد کالج کے دوسرے کیمپس کے پرنسپل ڈاکٹر این۔ ساہا نے میمورنڈم کی کاپی قبول کرتے ہوئے کہا کہ میری ذاتی کوشش ہے کہ کالج میں اردو کا شعبہ ضرور شروع کیا جائے۔ اردو زبان سے انھوں نے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو بہت ہی شیریں زبان ہے اور جنگِ آزادی میں اس زبان کا نمایاں رول رہا ہے۔ انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کالج میں انفراسٹرکچر کی قلت کی وجہ سے ابھی تک اس پر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاسکا ہے۔ دورانِ گفتگو انھوں نے کہا کہ مقامی ایم ایل اے کی بھی کوشش ہے کہ جلد سے جلد اردو شعبے کا قیام عمل میں آئے۔ اگر جگدل یا کالج کے اطراف میں جگہ دستیاب ہو تو کالج اسے خرید کر نئے شعبے کے آغاز کے لیے بھی تیار ہے۔
(آزاد ہند۔ کلکتہ)

حکومت کے دفاتر میں اردو سائن بورڈز نصب کرنے کے لیے ضلع کلکٹر کو یادداشت

شمس آباد (۶ فروری)۔ محمد مشتاق محی الدین (صدر مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن شمس آباد منڈل، رنگاریڈی) نے بتایا کہ آج کل اردو کو کچھ لوگوں کی جانب سے دوسرا درجہ دینے سے گریز کیا جارہا ہے جب کہ ایک طویل عرصے سے یہ بھی دیکھا جارہا ہے کہ حکومتی ادارے خصوصاً اور عوامی ادارے عموماً آندھرا پردیش کی دوسری سرکاری زبان اردو کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش میں ہیں۔ حالاں کہ اردو کو حکومتِ آندھرا پردیش کی جانب سے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ حکومت کے تمام اداروں کے درخواست فارمس وغیرہ صرف انگریزی اور تلگو زبان میں فراہم کیے جارہے ہیں جس کی وجہ سے اردو کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے جب کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس زبان کو استعمال کررہے ہیں اور یہ ان کی بھی مادری زبان ہے۔ اردو میں سائن بورڈز اور درخواستیں جاری نہ ہونے کی وجہ سے عوام کو کئی ایک مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ مشکلات سے دوچار ہورہے ہیں۔ مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن شمس آباد منڈل نے اس سلسلے میں ایک یادداشت ضلع کلکٹر کو پیش کی اور مطالبہ کیا کہ حکومت اور ڈسٹرکٹ کلکٹر خود بھی حکومتی اداروں پر بڑے اردو سائن بورڈز لگائیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے تحت کے تمام دفاتر بشمول اسکول، کالجس، ایم ای او آفس، تحصیلدار (ایم آر او) آفس، ایم پی ڈی او آفس، پنچایت آفس وغیرہ کو بھی اس بات کا پابند کریں کہ وہ ایک طرف عوامی سہولت کو ملحوظ رکھیں تو دوسری طرف حکومتی احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے اردو سائن بورڈز اپنے اپنے دفاتر پر نصب کریں اور اردو میں بھی فارم فراہم کریں تاکہ عوام کو سہولت ہو، کیوں کہ اردو ایک عام فہم زبان ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ہر شخص اردو بول سکتا ہے جب کہ حکومتی احکامات صرف اور صرف کاغذات پر اور دفتری فائل کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ محمد مشتاق محی الدین نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو کو آندھرا پردیش میں جو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے اس کو بغیر کسی امتیاز اور لسانی تعصب کے حقیقی معنی میں روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے ریاستی حکومت تمام حکومتی اداروں پر اردو سائن بورڈز نصب کرنے اور تمام اقسام کی درخواستوں کی اردو میں وصولی کو یقینی بنانے کے لیے مسلم اسٹاف اور اردو سے واقف لوگوں کو سرکاری اداروں میں مقرر کرے اور زبانی وعدوں سے انحراف کرتے ہوئے عملی میدان میں بھی اردو زبان کو وہی درجہ دیا جائے جس کا وعدہ اور دعویٰ کیا جارہا ہے۔
(منصف۔ حیدرآباد)

ونپرتی، گدوال، شاد نگر، کلواکرتی، ناگر کرنول، ابراہیم پٹنم اور نارائن پیٹ میں اردو درخواستوں کا لیا جانا، بس اسٹینڈز اور چیف فارمس کے بورڈ پر اردو تحریر کیا جائے اور ڈپو میں اردو جاننے والوں کا تقرر کیا جائے اور آر ٹی سی کی جانب سے تقرریوں اور ملازمت کے لیے درخواست فارم انگریزی اور تلگو کے ساتھ اردو میں بھی جاری کیا جائے اور آر ٹی سی کی جانب سے جو تقرریوں کے اشتہارات دیے جاتے ہیں تلگو اخبارات کی طرح اردو اخبارات کو بھی اشتہارات دیے جائیں۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ کو اعزاز

ناگپور (ڈاک سے)۔ مہاتما پھلے ٹیلنٹ ریسرچ اکادمی کی جانب سے ناگپور میں منعقد اکادمی کی چالیسویں کانفرنس میں معروف ادیب ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ساہتیہ ساگر کی سند سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج، ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مہیش کمار یگی، آسٹریلیا سے تشریف لائی مہمانِ خصوصی سلنداپارکر، بھنا سوریہ ونشی اور اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر چندر بھان پھرہی بھی موجود تھے۔
ڈاکٹر محمد اسد اللہ انشائیہ نگار اور مراٹھی ادب کے مترجم کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرا چکے ہیں۔ ان کی نو کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان کی تازہ تصنیف 'نگر اور پرچھائیاں' تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مختلف اکادمیوں نے انھیں انعامات سے نوازا ہے۔ فی الحال وہ ناگپور کے ایک اردو جونیئر کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اک دیا اور بجھا

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب اور افسانہ نگار جناب مانک ٹالا کا ۱۹ فروری ۲۰۱۳ء کو ممبئی میں انتقال ہوگیا۔
مرحوم کے پس ماندگان میں اکلوتی بیٹی انیتا سرین، داماد ارون سرین اور دو نواسے اشیش اور کرن شامل ہیں۔ اتفاق سے بیٹی، داماد اور بچے گزشتہ چند مہینوں سے ان کے پاس ہی تھے۔ مانک ٹالا کی آخری رسوم ممبئی کے شیواجی پارک (دادر) میں ادا کی گئیں۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۳ء کو غیر منقسم ہندوستان کے شہر لاہور میں پیدا ہونے والا یہ ادیب عمر کی کم و بیش ۸۹ بہاریں دیکھنے کے بعد چل بسا۔ ان کے آباؤ اجداد مالیر کوٹلہ میں ہیرے جواہرات کا کاروبار کرتے تھے، اسی مناسبت سے یہ خاندان مانک ٹالا کہلانے لگا تھا۔
مانک ٹالا صاحب کی ادبی خدمات میں پریم چند کے افسانوی ادب پر ان کی تحقیقی کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں میں پریم چند اور تصنیفاتِ پریم چند، کچھ نئے تحقیقی گوشے، پریم چند: کچھ نئے مباحث، پریم چند: حیاتِ نو، پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین نیز توضیحِ پریم چند شامل ہیں۔ ان کے تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ۲۰۰۵ء میں 'بابائے اردو اور جہانِ یوسف' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کے علاوہ ان کے کئی افسانوی مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔
گوپال کرشن مانک ٹالا کی خدمات کے اعتراف میں کولکاتا سے شائع ہونے والے ادبی ماہنامہ 'انشا' اور راولپنڈی کے 'پیلارو' نے علی الترتیب ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں گوشے شائع کیے تھے۔
ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔
(ادارہ)

○

دہلی۔ اردو کے معروف صحافی جناب سید اصغر علی کا مختصر علالت کے بعد ۸ مارچ ۲۰۱۳ء کو انتقال ہوگیا۔ ۹ مارچ کو صبح دس بجے دہلی گیٹ کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ سید اصغر علی دہلی میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھے۔ ۱۹۹۰ء میں ریٹائرڈ ہونے کے بعد روزنامہ 'عوام' سے وابستہ رہے۔ اس وقت اس کے مدیر انور علی دہلوی تھے۔ وہاں انھیں اردو کے سینئر صحافی مودود صدیقی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ 'عوام' کی ملکیت شاہد صدیقی کے نام تبدیل ہونے کے بعد بھی وہ اس سے منسلک رہے لیکن اس کا دفتر نظام الدین منتقل ہونے کے سبب 'عوام' کو چھوڑ کر انھوں نے روزنامہ 'الجمعیۃ' جوائن کیا اور آخری دم تک اس سے وابستہ رہے۔ سید اصغر علی مخلص، محنتی اور دیانت دار شخص تھے، ان کا تعلق جس ادارے سے بھی رہا وہ اس ادارے کو اپنا سمجھ کر کام کرتے تھے اور ادارے کے مفاد کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔
ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

ڈبلیو بی سی آر او ایس اسکول میں جون سے اردو ہندی کی بھی تدریس ہوگی

کولکاتا (۲۰ فروری)۔ جون سے شروع ہونے والے تعلیمی سال سے ویسٹ بنگال کونسل آف ربندرا اوپن اسکول (ڈبلیو بی سی آر او ایس) اردو، ہندی اور ہوم سائنس کی تدریس شروع کرنے جارہا ہے۔ ڈبلیو بی سی آر او ایس کے صدر فالگونی مکھرجی نے کہا ہے کہ اردو اور ہندی کے مسودات تیار ہیں اور نیپالی کا مسودہ بھی جلد ہی تیار ہوجائے گا۔ فالگونی مکھرجی نے کہا کہ مختلف حلقوں کی جانب سے نصاب میں نیپالی، اردو، انگلش، ہندی اور ہوم سائنس شروع کرنے کے لیے درخواست کی جارہی تھی اس لیے مذکورہ زبان کے بولنے والوں کے لیے ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ سبجیکٹ کے ماہروں نے متعلقہ کتابوں کا نصاب تیار کیا ہے۔ فی الحال کلاس X میں 9 سبجیکٹ، XI اور XII کلاس میں 5 سبجیکٹ پڑھائے جاتے ہیں۔ ڈبلیو بی سی آر او ایس میں اپنے نام درج کرانے والے طلبہ کلاس X کا امتحان زیادہ سے زیادہ 9 بار اور کلاس XII کے امتحان میں زیادہ سے زیادہ 5 بار امتحان میں بیٹھ سکتے ہیں۔ فی الحال ڈبلیو بی سی آر او ایس کے رجسٹر میں مجموعی طور پر 45000 طلبہ کے نام درج ہیں۔
(آزاد ہند۔ کلکتہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مکتوبات مظفر حنفی بنام محبوب راہی
مرتب : ڈاکٹر محبوب راہی
صفحات : ۲۳۰ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : ڈاکٹر محبوب راہی، باری ٹاکی ضلع آکولہ-444401
تبصرہ نگار : مفتی حبیب الرحمٰن ندوی

موجودہ دور میں جدید سائنسی ایجادات نے برسہا برس کی دیرینہ خوشگوار روایات کو شکست و ریخت کا اعلامیہ بنا دیا ہے۔ ٹیلی فون، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی نے خطوط نگاری کی دلچسپ اور خوب صورت روایات کو داستان پارینہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسے میں کسی صاحب طرز ادیب کے بیک وقت کم و بیش ڈیڑھ سو خطوط کا مجموعہ منظر عام پر آنا ایک نعمت غیر مترقبہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اردو میں خطوط نگاری کو باقاعدہ ایک صنف کا درجہ عطا کرنے کا اعزاز غالباً خطوط غالب ہی کو حاصل ہے۔ خطوط اس سے پہلے بھی لکھے گئے ہوں گے اور بعد میں بھی لکھے جائیں گے لیکن وہ بات کہاں اسمٰعیل مدن والی۔

اردو ادب میں مکتوب نگاری کے میدان میں ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، ڈپٹی نذیر احمد، محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، فراق گورکھپوری، شاد عارفی اور منیب الرحمٰن سے ساحر لدھیانوی تک ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔

یہ خطوط اردو کے منفرد لب و لہجے کے شاعر، ادیب اور نقاد پروفیسر مظفر حنفی نے اپنے دوست معروف شاعر و ادیب محبوب راہی کے نام ایک مقصدیت کے تحت لکھے ہیں۔ محبوب راہی صاحب نے موصوف پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مظفر حنفی نے راہی صاحب کو جابجا اپنے خطوط کے ذریعے مشفقانہ مشورے دیے ہیں جن کا اندازہ ان خطوط کی روشنی میں بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ان خطوط میں علمیت کی چاشنی اور ادبیت کے ذائقے کے ساتھ خطوط غالب والے مکالماتی انداز نے لطف و انبساط کی عجیب لذتیں پیدا کردی ہیں۔ ان خطوط کا ایک افادی پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں تحقیق کے سلسلے میں جو بیش بہا مشورے مکتوب نگار نے مکتوب الیہ کو دیے ہیں ان سے تحقیق کے میدان میں کام کرنے والے طلبہ بھی فیض یاب ہوسکتے ہیں۔ نشان خاطر رہے کہ دیگر مکتوب نگاروں کی طرح حنفی صاحب کے ذہن میں بھی خطوط لکھتے ہوئے یہ بات قطعی نہیں ہوگی کہ یہ خطوط محفوظ رکھے جائیں گے اور کبھی ان کی اشاعت کی بھی نوبت آئے گی ورنہ ان خطوط میں ایسی بے تکلفی، بے ساختگی، بے باکی، واقعیت پسندی اور غیر مصلحت پسندانہ صاف گوئی کی جھلکیاں اس قدر افراط سے نہ ملتیں جیسا کہ ان خطوط میں جابجا جھلکتی ہیں۔ بطور مثال چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"یوں بھی نقاد مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ اپنے مضامین اور مطلعوں میں انھیں چھیڑتا رہتا ہوں۔ ترقی پسند مجھے جدید شمار کرتے ہیں اور جدید لوگوں کو میں ترقی پسند نظر آتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کبھی خوشامد اور تعلقات استوار کرنے کی روش اختیار کی نہ گروپ بندی کی، اس کے باوجود لوگ اگر کسی نہ کسی طرح اعتراف کرتے ہیں تو دراصل یہ ان کی مجبوری ہے"۔
(۲ مارچ ۱۹۸۰ء کے طویل مکتوب سے)

"بھائی جتنا کچھ اس دور ابتلا میں کہیں سے مل جائے غنیمت جانو کہ آج کل متاع سخن کے خریدار کہاں ہیں اور خوشامد وغیرہ جیسے حربے استعمال کرنے کے لیے بھی ظرف چاہیے جو ہمارے پاس نہیں"۔
(۲۸ نومبر ۱۹۸۰ء کے طویل مکتوب سے)

"مدیران رسائل کی نگاہ میں تیری انچ نیچی ہوئی ہے اسے برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی کسی کتاب پر تبصرے کے لیے ایک کے بعد دوسرا خط کسی مدیر کو نہیں لکھا"۔
(۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کے مکتوب سے)

"تبصری سفارش کا طریقہ وہ نہیں ہوتا جو تم یا رضا حسن پسند کرتے ہو کہ بلاواسطہ کاوش سے کئی کا پہلو نکلتا ہے کوشش کرتا ہوں کہ متعلقہ شخص کا وقار بھی قائم رہے۔ بظاہر سفارش بھی نہ معلوم ہو اور نتیجہ خاطر خواہ نکلے"۔
(۲۵ فروری ۱۹۸۳ء کے طویل مکتوب سے)

ان خطوط میں جہاں محبوب راہی کے تئیں حنفی صاحب کی بے انتہا محبتیں اور بے پناہ شفقتیں جھلکتی ہیں، کہیں کہیں تلخی اور ترشی بھی در آتی ہے۔ یہاں محبوب راہی صاحب کو داد دینے ہی بنتی ہے کہ انھوں نے ان خطوط کو شامل کرنے میں بھی قطعی کوئی جھجک محسوس نہیں کی جن میں حنفی صاحب کی سخت گیری جھلکتی ہے۔

یکم مارچ ۱۹۷۸ء تا ۳ فروری ۲۰۰۵ء 27 برسوں کی اس مدت کے دوران تحریر کردہ ایک سو چالیس (140) خطوط کے اس مجموعے پر 32 صفحات پر پھیلا طویل مقدمہ محبوب راہی نے تحریر کیا ہے جو 'تہذیب گزشتہ کا آخری باب' عنوان کے تحت کتاب کے اولین صفحات میں شامل ہے، جسے کتاب کا مغز کہا جاسکتا ہے۔ اس میں راہی صاحب نے اردو میں مکتوب نگاری کی روایت معروف مکتوب نگاروں کے تذکرے کے ساتھ مظفر حنفی کے خطوط کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ نیز ان خطوط کے وجہ جواز کے ساتھ ان کی افادیت پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، جس سے ان کے دل میں مظفر حنفی کے تئیں بے پناہ عقیدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

معروف عرشیہ پبلی کیشنز دہلی نے گزشتہ چند برسوں سے اردو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ایک اعتبار و اعتماد کی روایت قائم کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان روایات میں ایک خوب صورت اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔

○○○

نام کتاب : پریمی رومانی: فکر و فن
مرتب : پروفیسر محمد اسد اللہ وانی
صفحات : ۴۰۰ صفحات
قیمت : ۴۰۰ روپے
ملنے کا پتا : رچنا پبلی کیشنز 1/3 نصیب نگر، جانی پور جموں-۱۸۰۰۰۷
تبصرہ نگار : ڈاکٹر مول راج

ڈاکٹر پریمی رومانی کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ادبی دنیا میں بطور شاعر، محقق، نقاد، مبصر اور ترجمہ نگار کے طور پر اپنی شناخت قائم کرچکے ہیں۔ وہ گزشتہ نصف صدی سے شعر و ادب کے گیسو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ وہ اُن حضرات میں سے نہیں ہیں جو کام کم اور ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں بلکہ اُن کا شمار ایسے اشخاص میں ہوتا ہے جو گوشۂ تنہائی میں خاموشی سے اپنا کام کرنے کے قائل ہیں۔ دراصل یہی لوگ حقیقی شناخت کے حق دار ہوتے ہیں، لیکن افسوس کی بات ہے کہ عام قاری ایسی مخلص اور دلچسپ شخصیات سے یا تو بالکل ہی محروم رہ جاتے ہیں یا پھر ادھوری معلومات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں شعر و ادب پر نظر رکھنے والوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ نہایت ایمانداری کے ساتھ اُن لوگوں کی ادبی و علمی خدمات کو عام قاری سے متعارف کرائیں جو بجوئن ہیں تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد اسد اللہ وانی نے 'پریمی رومانی: فکر و فن' کے عنوان سے کتاب مرتب کرکے جہاں حقدار کا حق ادا کیا ہے وہیں عام قاری کو ایک ایسا ادبی تحفہ بھی عطا کیا ہے جو پریمی رومانی کی حیات اور ادبی خدمات سے متعلق گراں بہا معلومات فراہم کرتا ہے۔

'پریمی رومانی: فکر و فن' شخصیاتی، تجزیاتی، تاثراتی اور انتقادی مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں کل 35 مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے تھے۔ مرتب نے تلاش بسیار کے بعد ان کو حسن و خوبی سے ترتیب دے کر اس کتاب میں یکجا کردیا ہے۔ مشمولات کو موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے مرتب نے چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلے باب میں 25 مضامین شامل ہیں۔ سب سے اول 'پیش گفتار' کے عنوان سے مرتب نے ڈاکٹر پریمی کی حیات اور ادبی خدمات پر نہایت محدود مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ یہ مقالہ جہاں پریمی کے شاندار ادبی سفر کی نشاندہی کرتا ہے وہیں اُن کی زندگی کے چند پوشیدہ پہلوؤں پر روشنی بھی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد 'پریمی رومانی تصویری لمحوں میں' کے زیر عنوان بعض اہم تصاویر شائع کی گئی ہیں، بعد ازاں پیتامبر ناتھ دور فانی کاشمیری کی نظم 'پریمی رومانی کی نذر' کو پیش کیا گیا ہے۔

زمرۂ اول شخصیاتی و تاثراتی مقالات کے تحت پروفیسر منصور حسین خاں، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر عالم خوندمیری، دیپک بدکی، زبیر رضوی، محمد ایوب واقف، پروفیسر مرغوب بانہالی، ڈاکٹر دلیپ کمار شرما کے مقالات کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ مقالات ڈاکٹر پریمی رومانی کی زندگی کے حقائق و کوائف اور ان کے طویل ادبی سفر سے متعلق جملہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

زمرۂ دوم تنقیدی و تجزیاتی مضامین کے تحت سلیم امام، پدم شری موتی لال ساقی، پیتامبر ناتھ دور فانی، ارجن دیو مجبور، عبدالحق نعیم، پشکر ناتھ، ڈاکٹر ایاز رسول نازکی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، محمد متین ندوی اور ڈاکٹر تہمینہ اختر کے مختلف تجزیاتی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں پریمی کی بعض اہم تخلیقات پر تنقیدی اور تجزیاتی مضامین احاطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

کتاب کے دوسرے باب میں اقبالیات کے زیر عنوان پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر رئیس احمد اور ڈاکٹر مشتاق وانی کے فکری و علمی شعور کا نتیجہ ہیں۔ ان حضرات نے پریمی رومانی کی اقبال شناسی پر بات کرتے ہوئے اپنے مضامین میں اس طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ پریمی رومانی نے اپنی تصنیف میں کلام اقبال کی افہام و تفہیم کے چند نئے پہلو اجاگر کرکے جہاں اپنی دیدہ ریزی اور گہرے مطالعے کا ثبوت فراہم کیا ہے وہیں عاشقان اقبال کی فہرست میں اپنا نام بھی درج کروایا ہے۔

'پریمی رومانی: فکر و فن' کے تیسرے باب میں 'شاعری' کے عنوان کے تحت پروفیسر محمد اسد اللہ وانی، عرش صہبائی اور مشتاق احمد وانی کے تین مقالات شامل کیے گئے ہیں جو پریمی کی شاعری سے متعلق تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کے آخری باب میں 'ترجمہ' عنوان کے تحت تین مضامین اور ایک انٹرویو شامل کیا گیا ہے۔ اپنے مقالات میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، پرتھوی ناتھ کول، ساحل کاشمیری اور جگن ناتھ ساگر نے ڈاکٹر پریمی رومانی کو ایک مترجم کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے ترجمہ نگاری کے فن پر تفصیلاً اظہار خیال بھی کیا ہے۔ اس باب کے آخر میں منیر احمد جامی کے ساتھ ڈاکٹر پریمی رومانی کے ایک انٹرویو کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ انٹرویو بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔

مجموعی طور پر زیر تبصرہ کتاب

پریمی رومانی: فکر و فن پروفیسر محمد اسد اللہ وانی کی قابلِ قدر کوشش ہے۔ یہ کتاب پریمی کی شخصیت اور ان کی مجموعی علمی و ادبی خدمات سے متعلق ہر گوشے کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی غیر متعصب اور غیر جانبدار قلم کار کی حیثیت سے برصغیر ہند و پاک میں مشہور و معروف ہیں۔ ان کے فکر و فن میں جہاں روایتی قندیلیں روشن ہیں وہیں نئے تجربات کے چراغ بھی جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں موصوف کی شخصیت اور فن پر ایک ایسی جامع کتاب کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے جو ان کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف جہات کو چراغ دکھانے کا کام کرے۔ پروفیسر محمد اسد اللہ وانی نے 'پریمی رومانی: فکر و فن' کے عنوان سے کتاب مرتب کرکے اس سلسلے میں پہلا قدم اٹھایا ہے۔ انھوں نے پریمی کی شخصیت اور فن پر نہایت ہی محنت، تندہی اور سلیقے سے کتاب میں شامل مضامین منتخب کرکے اپنی ترتیبی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ تمام مضامین اردو ادب کے معتبر اور مقتدر شخصیات کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ کتاب پریمی رومانی کی ادبی خدمات کا اعتراف نامہ ہے جو ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مفید ثابت ہوگی۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس سنجیدہ کوشش کے لیے پروفیسر وانی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ قوی توقع ہے کہ موصوف کی اس کوشش کو ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

○○○

بقیہ: سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن...

(سے آگے)

ہوئے لکھا کہ

"آخری فقرہ کے لکھنے میں ترتیب اس طرح ہوتی: تاج محل، اردو اور غالب: تو ترتیب زمانی کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتی۔"[21]

اس طرح سیّد صاحب نے اس جملے میں خوب صورت اور مناسب ترمیم کرکے خالص ادب کے موضوع میں تاریخ کا عنصر شامل کرکے دلکش اور جاذبِ نظر امتزاج پیدا کر دیا ہے تاکہ ایک ہی جملے سے قاری دونوں موضوعات کا لطف اٹھائے۔ اس سے مصنف کے ادبی شعور کے ساتھ ساتھ مورخانہ بصیرت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ترمیم ملاحظہ ہو:

"مغلیہ سلطنت نے اپنے عروج کے دور میں تاج محل دیا تو مرتے مرتے بھی اردو اور غالب دے گئی۔"[22]

ترمیم کے بعد اس جملے میں مغلیہ سلطنت کے کمال اور زوال دونوں عہد کے کارنامے سامنے آ جاتے ہیں۔

ایک جگہ غالب کی اولیت سے متعلق رشید صاحب کے اس جملے "اردو شاعری میں غالب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے" کے متعلق لکھتے ہیں کہ معلوم نہیں رشید صاحب نے یہ کیسے لکھ دیا، اردو شاعری میں غالب سے پہلے کے شعرا کے یہاں حرم، کعبہ، زاہد، واعظ، شیخ اور ناصح پر طنزیہ اشعار بہت ملیں گے ان پر طنز تو خدا ہی پر طنز ہے۔[23] اسی طرح رشید صاحب کے اس خیال "یہ غالب ہی کا کارنامہ تھا جس نے غزل کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو غزل بنا دیا" کے برخلاف میر کے پرستار اثر لکھنوی کے اس خیال "غالب نے غزل میں جو کچھ کہا ہے اس سے کہیں زیادہ میر اپنی غزلوں میں کہہ گئے ہیں پھر میر کے سر سے غزل کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو غزل بنانے کا سہرا کیوں اتار لیا جاتا ہے" کو بہ طور تائید پیش کیا ہے اور رشید صاحب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے۔ پھر لفظ کلچر کے مفہوم و معنی اور اصطلاح پر طویل اور بڑی پُرمغز بحث کی ہے اور خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور حمید احمد خاں وغیرہ نے غزل میں غالب کے ذریعے کلچر کی شمولیت پر جو معرکہ آرا تحقیقات پیش کی ہیں ان پر بھی کافی نظر ڈالتے ہوئے رشید صاحب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے جو یقیناً پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ تفصیلات بہ خوفِ طوالت قلم انداز کی جاتی ہیں۔

اس مختصر اور اجمالی بحث سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کے اس کارنامے کی اصل قدر و قیمت کیوں ہے؟ اور غالب شناسوں کی طویل فہرست میں ان کو مناسب مقام نہ دیا جانا کس قدر حیرت انگیز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بیس برس بعد تک غالبیات کے مطالعے میں جو ارتقا ہوا اور گاہے گاہے اس میں جو نئی نئی تحقیقات سامنے آئیں ان تمام کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ سیّد صباح الدین صاحب نے جس منظم طریقہ و انداز سے پیش کیا ہے، ان سے پہلے نہ تو کسی نے اس قسم کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی ان کے بعد ہی کسی صاحبِ نظر نے اس قسم کی کوئی چیز پیش کی حالاں کہ اس طرح کے کاموں کی ضرورت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور آئے دن غالبیات میں اضافے ہوتے رہتے ہیں، ضرورت ہے سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کی طرح ان پر بھی تنقیدی و تجزیاتی نگاہ ڈالی جائے تاکہ غالب پر کیے گئے کاموں کی اصل اہمیت کا پتا چلے اور دار المصنفین نے غالبیات پر کام کرنے کی جو طرح ڈالی تھی، اس کا سلسلہ دراز ہو۔ یہ سلسلہ غالب شناسوں کی خدمات کی قدر و قیمت کا تعین بھی کرے گا اور شیدایانِ غالب کے لیے مفید بھی ہوگا۔

حواشی:

1. 'معارف' دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۲، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
2. 'غالب مدح و قدح کی روشنی میں' حصہ اول، ص ۱، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء
3. ایضاً، ص ۲
4. فکر و نظر (سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن نمبر)، ص ۲۷، ۳۰، ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ اسلامیہ، اسلام آباد، جنوری و مارچ ۱۹۸۹ء
5. سیّد صباح الدین: حیات و خدمات، ص ۱۱۹، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۹ء
6. 'غالب مدح و قدح کی روشنی میں' جلد اول، ص ۳
7. ایضاً، ص ۱۸۳
8. ایضاً، ص ۳۲۷
9. ایضاً، ص ۲۳۰
10. ایضاً، جلد دوم، ص ۲۹۹
11. ایضاً، ص ۱۰۸–۱۰۷
12. ایضاً، جلد اول، ص ۱۳۶
13. ایضاً، ص ۶۳
14. ایضاً، ص ۶۶
15. ایضاً، ص ۱۴
16. ایضاً
17. ایضاً
18. ایضاً، جلد دوم، ص ۲۷۷
19. ایضاً، ص ۲۷۸
20. ایضاً
21. ایضاً، ص ۲۸۱
22. ایضاً، ص ۲۸۲
23. ایضاً، ص ۲۸۴

○○○

بقیہ: اوج یعقوبی کی شخصیت اور شاعری

(صفحہ ۸ سے آگے)

ناسپاسانِ وقت کے چہروں سے نقاب اتری جہاں وہ مسلماں جن سے خود اسلام شرماتا رہا
حق اسی میدان میں آکر ہوا ہے سرخرو
تحت اسی میدان میں آکر ظفر یں کھاتا رہا

بیمارِ کربلا (حضرت زین العابدین) پہ جو ستم ہوئے اس کا انھوں نے اس طرح نقشہ کھینچا ہے:

پا بہ زنجیر ایک بیمار اور رسن شام کا
ہر قدم پہ غش کیا گرا، بیٹھا، اٹھا

حضرت امام عالی مقام کی قربانیوں کا اجمالی خاکہ ملاحظہ ہو:

گھر بار کے لٹنے کی ہے یا آخری تفصیل
بیمار کا بستر ہے نہ زینت کی ردا ہے

امامت اور ولایت کے تعلق سے اوج یعقوبی اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہیں:

دنیا میں امامت کی نیابت ہے ولایت
ہوتا ہے ولی ابنِ ولی آلِ نبیؐ سے

(باقی آئندہ)

☆☆☆☆☆

(پہلی قسط)

اوج یعقوبی کی شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر سید بشیر احمد (فلیٹ نمبر B-1، سکھ متی اپارٹمنٹ، لکڑی کا پل، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴)

اوج یعقوبی کی تاریخ پیدائش ۱۰ر مارچ ۱۹۱۳ء ہے۔ اُن کے والد کا نام سید یعقوب صاحب مرحوم ہے۔ انھوں نے ان کا نام سید عبداللہ رکھا تھا۔ تسمیہ خوانی کی رسم میں اخبار روزنامہ 'صحیفہ' کے مدیر مولانا اکبر علی مرحوم نے اقرا کی تلاوت کروائی تھی۔ انھوں نے مدرسہ تحتانیہ چادر گھاٹ، چپل گوڑہ ہائی اسکول اور گوشہ محل میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ادارۂ حمیدیہ میں انھوں نے منشی اور فاضل کی تعلیم حاصل کی۔ جس زمانے میں اُن کے والد سمنٹ بلاک میں سکونت پذیر تھے جو ملک پیٹ ریلوے اسٹیشن کے روبرو تھا، اس کے اکناف میں جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، خورشید تقی، پروفیسر عبدالقیوم خاں باقی اور احمد نواز جنگ فانی جیسے باکمال علمی، ادبی اور شاعرانہ ذوق رکھنے والے حضرات رہائش پذیر تھے۔ ان سارے لوگوں کے گھروں میں وہ اپنی کم سنی کی وجہ سے گھومتے رہتے تھے۔ وہ مہاراجا کشن پرشاد شاد کی ڈیوڑھی میں ہونے والے ماہانہ مشاعروں میں اور ہر ہلالی مہینے کی ۱۲ تاریخ کو روزنامہ 'صحیفہ' کی میلاد بلڈنگ میں ہونے والے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کیا کرتے تھے۔ اس طرح اُن میں ذوقِ شاعری پروان چڑھتا رہا۔ ابتدا میں وہ اختر تخلص کیا کرتے تھے۔ اُن کی شاعرانہ زندگی کا پہلا شعر ملاحظہ فرمایئے:

تری جدائی نے دیوانہ کر دیا مجھ کو
ترے فراق نے شاعر بنا دیا مجھ کو

کچھ عرصہ بعد انھوں نے اشرف تخلص اختیار کیا۔ ان کے بہنوئی سید تاج الہدیٰ جو اپنے دور کے مقبول شاعر تھے، انھوں نے ان کو مشورہ دیا کہ تخلص دو حرفی یا زیادہ سے زیادہ سہ حرفی ہونا چاہیے ورنہ اکثر بحر میں زحمت ہوتی ہے۔ انھوں نے ان کے لیے اوج تخلص تجویز کیا۔ اس کے بعد اوج نے اسی تخلص کو اپنایا اور اپنے والد کے نام کی نسبت سے یعقوبی کا اضافہ کرلیا۔ اس طرح ادبی دنیا میں وہ اوج یعقوبی کے نام سے مشہور ہوئے۔

صفی اورنگ آبادی کی ڈگر پر چلتے ہوئے انھوں نے شاعری کو ذریعۂ آمدنی بنایا اور کتنے ہی شاعروں کو شاعر بنا دیا۔ اوج نے پہلا مشاعرہ روزنامہ 'صحیفہ' کی میلاد بلڈنگ میں پڑھا تھا، اس کے بعد وہ اہم شعرا جیسے ضامن کنتوری، صفی اورنگ آبادی، فصاحت جنگ جلیل، امجد حیدرآبادی، حیرت بدایونی، نجم آفندی، ضیا یار جنگ ضیا، کامل شطاری، قدر عریضی، وزیر رنگ، راج عالی، ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکینہ الہام، جذب عالم پوری، بہزاد، واسودیو ذکی، سعید شہیدی، خورشید احمد جامی اور خواجہ شوق وغیرہ کے ساتھ بیسیوں مشاعرے پڑھے۔ اوج یعقوبی نے تقریباً تمام اصنافِ سخن مثلاً حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، سلام، مثنوی، قصیدہ، آزاد نظم، قطعہ، رباعی اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل گوئی میں اوج کو اپنے ہم عصر شعرا میں امتیازی اور منفرد مقام حاصل رہا۔ ان کو قواعدِ زبان اور فنِ شاعری پر کامل دسترس حاصل تھی۔ فنی باریکیوں سے خوب واقف تھے۔ ایک اور مشابہت صفی اورنگ آبادی سے اُن کی یہ تھی کہ انھوں نے دکنی محاوروں کو اپنی شاعری میں بڑے سلیقے اور دلکش انداز میں استعمال کرکے محاوروں کو اعتبار بخشا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ صفی اورنگ آبادی کی شعری روایتوں کو انھوں نے زندگی بخشی۔ گرچہ اوج یعقوبی کا تعلق قدیم دبستانِ شاعری سے رہا لیکن انھوں نے حسن و عشق، ہجر و فراق اور گل و بلبل کی حکایات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جدید رجحانات اور مسائل کو بھی اپنے پیش نظر رکھا۔ انھوں نے سماجی مسائل پر بھرپور توجہ دی۔ وہ نہ صرف اچھے شاعر بلکہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ ان کے دوسرے شعری مجموعے 'تحریرِ لب بستہ' پر ان کا لکھا ہوا دیباچہ ان کی انشا پردازی اور ناقدانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اگر وہ اس جانب توجہ دیتے تو اردو نثر میں بھی بیش بہا اضافہ ممکن تھا۔ انھوں نے عبدالقیوم خاں باقی سے باضابطہ تلمذ اختیار کیا اور اُن سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام 'گرفتِ نظر'، دوسرا 'تحریرِ لب بستہ' اور تیسرا مجموعۂ کلام 'اوجِ عرش' (جو نعتوں اور منقبتوں پر مشتمل ہے) زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ اوج یعقوبی کی نعتوں اور منقبتوں کو پڑھنے سے قاری کو اوج کی رسالت مآبؐ اور اہلِ بیتِ اطہار سے والہانہ عقیدت اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا یہ سارا کلام فنی خوبیوں سے آراستہ ہے اور ان کے نعتیہ اور منقبتی کلام سے محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے کلام کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ نعت گوئی میں الوہیت اور عبدیت کے مدارج پر بڑی احتیاط سے لب کشائی کرنی پڑتی ہے اور اوج یعقوبی نے اس احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے نعتیہ کلام میں فرمودات نبوی کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے جہاں پر رسول مقبولؐ کی بارگاہ میں اپنی عقیدت اور محبت کے پھول بکھیرے ہیں، جن کے پڑھنے سے قاری کے قلوب گرما جاتے ہیں اور ان کے دلوں میں بھی رسول اقدسؐ کے تعلق سے محبت کی چنگاریاں شعلہ بننے کے لیے بھڑکتی ہیں۔ ذیل میں ان کے چند منتخب نعتیہ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

صبا جو بھی کہنا ہو تجھے یہ چشمِ نم کہنا
ادب سے پہلے تو آنکھوں کو ملنا پائے اقدس سے

مدینہ دیکھوں یہ آخری حسرت ہے جیتے جی
دعائیں ہیں بہت لیکن دعا کم ہے مرے آقا

جبرئیل رہنے دیجیے اب شوقِ رہنمائی
سدرہ کے آگے بھی سرکار جاتے ہیں

گھبرا کے رہ گئے ہیں جبرئیل سدرہ پہ ہیں اگر
تم ہو تمام لیتے تم ذرا سرکار کا دامن

ایک مسلسل نعت میں اوج یعقوبی کی سرکارِ دوعالمؐ سے وابستگی کا عکس نمایاں ہے۔ اس کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے علم بشر کتنا سرکار کے بارے میں
ہم لوگ کہیں کیا سرکار کے بارے میں
اے شوقِ سخن گوئی ہے شرط ادب ہشیار
کچھ کھیل نہیں کہنا سرکار کے بارے میں
کیوں ہے تو ہے سایہ ہو گیا ہے تو ہے جسمی
کیا کیا ہوا دھوکا سرکار کے بارے میں
جب عرش پہ پہنچے ہیں، تفصیل سبھی آئی
جبرئیل نے تب سوچا سرکار کے بارے میں
سرکار بشر ہیں تو مثلِ بشر کیا ہے
اتنا کوئی سمجھا سرکار کے بارے میں
اوج اپنا سخن کتنا خود لوح و قلم گم ہیں
آسان نہیں لکھنا سرکار کے بارے میں

رسول اقدسؐ کی ایک حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ وہ علم کا شہر ہیں اور حضرت علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ اس مضمون کو اوج یعقوبی نے یوں باندھا ہے:

نبیؐ کی معرفت بے شک در حیدر سے ملتی ہے
یہ دولت جس کے گھر کی ہے اسی کے گھر سے ملتی ہے

مالک کی خبر گھر والوں سے ملتی ہے۔ اوج یعقوبی بھی بہ لحاظِ سیادت در رسولؐ سے وابستگی رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

قرابت آلِ احمدؐ سے میں جن کی گلی میں رہتا ہوں
ہے مالک گھر کا کیا خبر گھر سے ملتی ہے

اوج یعقوبی نے اپنے مرثیوں میں نہ صرف واقعاتِ کربلا میں خانوادۂ امام عالی مقام پر ڈھائے گئے جور و ستم بیان کیے بلکہ فلسفۂ شہادت اور اسوۂ حسنہ کی انسانیت دوستی اور حق پرستی کو شاعرانہ محاسن کے ساتھ پیش کیا ہے:

آپ سے حشر میں ہے اتنی گزارش آقا
اوج کو دیکھ کے بولیں مرا نوکر آیا

حضرت عباس پیکرِ وفا تھے۔ ان کی خدمتِ اقدس میں اوج یعقوبی خراجِ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

یہ بھی میرا ایمان ہے عباسِ دلاورؓ
تم جیسا کوئی مردِ وفا ہو نہیں سکتا
کعبہ میں روشنی بھی خونِ حسینؑ سے
عباس کے لہو سے چراغِ وفا جلا

اوج یعقوبی کی تاریخِ اسلام پر گہری نظر تھی۔ سانحۂ کربلا کے پس پشت جو سازشوں کا جال تھا، اس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں:

پہلوں گھونٹا ہے مجرموں نے پشتِ آل میں
نہ دیکھو کربلا میں ہاتھ کس کس کا اٹھا
ہر زمانے میں برابر یہ سوال اٹھتا رہا
کربلا کے واقعہ میں ہاتھ کس کس کا رہا
سلطنت گاہوں میں کچھ سازشیں کرتی رہیں
وقت بھی کچھ سازشوں کے جال پھیلاتا رہا
پھر اچانک ایک دن خطرے کی گھنٹی بج گئی
فلسفہ صلحِ حسنؑ کو وقت سمجھاتا رہا

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ___ (ادارہ)